R. N. 2166/57.

Regd. No. A 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Telephone No. 29

Telegrams: "ANJUMAN"

قیمت
سالانہ تین روپیہ
ایک پرچہ
دس نئے پیسے
تاریخ اشاعت
١-١١-٦١
٢٢

جلد ٢٠ - شمارہ ٤٠ | ایڈیٹر - آل احمد سرور | علی گڑھ - یکم نومبر ١٩٦١ء

اسلم پرویز

دبستان لکھنو

میر محمد امین سعادت خاں برہان الملک نیشاپوری دربار دہلی کی طرف سے اودھ کے پہلے نواب مقرر ہوئے اور لکھنؤ کے قریب گھاگھرا ندی کے کنارے قلعہ کی شکل کی ایک کچی عمارت بنا کر رہنے لگے۔ برہان الملک کو زیادہ عمارات کا شوق نہ تھا اس لئے اسی کچی عمارت کے احاطہ میں بیگمات کے محلات، دربار، توپ خانہ، فوج غرض ہر چیز موجود تھی۔ برہان الملک کے بعد صفدر جنگ اودھ کی حکومت پر تخت نشین ہوئے تو انھوں نے اس جگہ کو پختہ تعمیر کرایا اور اس کا نام فیض آباد رکھا۔ شجاع الدولہ کے عہد تک فیض آباد ہی اودھ کا دارالسلطنت تھا جب آصف الدولہ تخت نشین ہوئے تو انھوں نے دارالسلطنت فیض آباد سے لکھنؤ منتقل کر لیا۔

برہان الملک سے پہلے اودھ میں شیوخ برسر اقتدار تھے۔ برہان الملک کا تعلق سلاطین صفویہ سے تھا جنھوں نے شمشیر کے زور سے ایران میں مذہب اثنا عشری کی نشر و اشاعت کی تھی چنانچہ جب برہان الملک لکھنؤ پہنچے تو ان کے ساتھ ایران کا یہ خاص رجحان بھی لکھنؤ پہنچا اور آہستہ آہستہ حکمراں طبقہ کے یہ عقائد و نظریات لکھنوی تہذیب تمدن کا ایک نمایاں جز بن گئے۔ ان بدلتے ہوئے حالات کے اثرات نہ صرف لکھنوی تہذیب اور اخلاق معاشرت ہی پر مرتب ہوئے بلکہ شعر و ادب بھی ان کی زد سے نہ بچ سکے۔ دلّی کی غزلیہ شاعری کا موضوع تصوف اور داخلیت تھا اور اس طرز کے بانی مرزا مظہر، میر تقی میر اور خواجہ میر درد وغیرہ تھے۔ لکھنؤ کے ارباب حل و عقد کو تصوف سے کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ ایک طرح تصوف اور اثنا عشری کا تعلق رقیبانہ تھا کیونکہ ایران میں شاہان صفویہ کے ہاتھوں صوفیوں کو بڑے مصائب اٹھانے پڑے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اردو کی غزلیہ شاعری جب لکھنؤ کو آئی تو یہاں تصوف کو غزل سے خارج کر دیا گیا۔

دلّی میں شعرا اور ادبا کی معاش کا وسیلہ یا تو دربار تھا یا امرا اور رؤسا۔ نادری اور ابدالی حملوں کے بعد دلّی میں ایسی افراتفری پھیلی کہ اکثر امرا یا تو مارے گئے یا دلّی کو خیرباد کہہ گئے اور اس طرح دلّی کے اہل ہنر پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا اور ان کی نگاہیں دلّی سے باہر اٹھنے لگیں۔ جب دلّی تباہ ہوئی تو لوگ وطن چھوڑ چھوڑ کر اطراف ملک میں پھیلنے لگے۔ شعرا نے زیادہ تر فرخ آباد اور اودھ کا رخ کیا کیونکہ ایک تو یہ قریبی ریاستیں تھیں دوسرے یہاں متاع ہنر کے قدردان موجود تھے۔ میر، سودا، میر حسن، جرأت، انشا، رنگین اور مصحفی وغیرہ کو لکھنؤ میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور خوب قدر افزائی کی گئی۔ میر کے لکھنؤ پہنچنے کے سلسلے میں آب حیات کی یہ روایت ممکن ہے غلط ہو لیکن یہ دہلوی اور لکھنوی مزاج کو بڑی حد تک واضح کرتی ہے:۔

> "ان کی وضع قدیمانہ کھڑکی دار پگڑی، پچاس گز کے گھیر کا جامہ، ایک پورا تھان پستولیہ کا کمر سے بندھا، ایک رومال پٹری دار تہ کیا ہوا اس میں آویزاں، مشروع کا پاجامہ جس کے عرض کے پائنچے .... غرض جب داخل محفل ہوئے تو وہ شہر لکھنؤ کے انداز، نئی تراشیں، بانکے ٹیڑھے جوان جمع، انھیں دیکھ کر سب ہنسنے لگے۔ میر صاحب بیچارے غریب الوطن، زمانے کے ہاتھ سے پہلے ہی دل شکستہ اور بھی دل تنگ ہوئے اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ شمع ان کے سامنے آئی تو پھر سب کی نظر پڑی اور بعض شخصوں نے پوچھا

لکھنؤ کا وطن کہاں ہے؟ میر صاحب نے فی البدیہہ کہہ کر غزل طرح میں داخل کیا ؎

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو!
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے برباد کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے"

لکھنؤ کی تہذیب و تمدن، شعر و ادب اور اخلاقی اور سماجی تصورات کی عظیم عمارت کی بنیاد ان ہی "منتخب روزگار" کے ہاتھوں رکھی گئی جو کبھی دہلی جیسے "عالم میں انتخاب" شہر کے لئے سرمایۂ ناز اور باعثِ فخر تھے اس لئے فطری طور پر ابتدائی زمانہ میں لکھنؤ کا چلن وہی تھا جو کبھی دہلی سے مخصوص تھا لیکن چونکہ اودھ کی حکومت سیاسی اعتبار سے دہلی حکومت کی حریف ہو گئی تھی اس لئے امراء و رؤساء شاعر اور ادیب اپنی انفرادیت پیدا کرنے کے لئے دہلی کی تہذیب سے اپنا رشتہ توڑ کر ایک نئی تہذیب کو جنم دینے لگے تھے مگر اس نئی تہذیب کی بنیاد بھی لازمی طور پر دہلی کی تہذیب پر رکھی جاتی تھی یہ بات اس وقت اور واضح ہو جاتی ہے جب ہم لکھنؤ کے ابتدائی شاعروں پر دبستان دہلی کے نمایاں اثرات دیکھتے ہیں مثلاً نواب آصف الدولہ کے کلام میں وہی خصوصیات ملتی ہیں جو دبستانِ دہلی کی جان ہیں۔ ان کے چند شعر یہ ہیں ؎

نہ وصال ہی میں قرار تھا نہ فراق ہی میں قرار ہے
وہ وصال کیسا دکھا گئے یہ فراق کیسا لگا گئے
مرے آگے سے جو گزر گئے تو پلک سے لاگی نہ پھر پلک
وہ جو ضبط کر کے رہا تھا میں مرے اشک آکے بہا گئے
درد دل اپنا میں اس شوخ سے کہتا لیکن
جو چھپانے میں مزا ہے نہیں اظہار کے بیچ

ایک رباعی بھی ملاحظہ کیجئے [1]

کیا تجھ سے کہوں کہ کس طرح گزرے ہے
کیا دوں پتہ کہ اس طرح گزرے ہے
بالفرض اگر کہا تو پھر کیا حاصل
گزرے ہے خیر جس طرح گزرے ہے

آصف الدولہ کے بعد لکھنوی شاعری کا وہ دور شروع ہوا جس کی ابتدا انشا، رنگین اور جرأت سے ہوتی ہے۔ دہلی کے مقابلہ میں لکھنؤ کی زندگی بے فکری، فارغ البالی اور عیش و عشرت سے عبارت تھی امراء اور حکام فنونِ لطیفہ کے قدر شناس اور دلدادہ تھے۔ شاعری موسیقی اور رقص و سرود ایک مستقل فن کی حیثیت حاصل کر چکے تھے اور شرفا خصوصاً خواتین کی مجلسوں کے لئے ایک جزو لازم بن گئے تھے کیونکہ اس زمانے میں عورتوں کی تعلیم کا رواج عام نہیں تھا اس لئے شریف گھرانوں کی عورتیں ان تمام فنون سے نابلد تھیں چنانچہ فنونِ لطیفہ کے دلدادہ اپنے مذاق کی تسکین کے لئے طوائفوں کی طرف رجوع کرتے تھے۔ لکھنؤ کی تہذیب میں طوائفوں نے ایک مستقل ادارے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ طوائفوں کے یہ ادارے بہت سے مشاغل اور تفریحات کے علاوہ آداب و اخلاق اور علم مجلسی کی درس گاہوں کا کام بھی دیتے تھے۔ اس زمانہ کی طوائفوں کا ایک خاص معیار تھا۔ وہ لکھنؤ کی تہذیب اور معاشرت کا تکمیلی جزو بن چکی تھیں، گھریلو عورتوں اور مردوں کے درمیان مشرقی روایات کی جو دیوار حائل تھی اس کے ردعمل کے طور پر طوائف کو جذباتِ عشق کا آلۂ کار اور شعری موضوعات کا محرک بننا پڑا۔ شادی بیاہ، خوشی غم، عید، محرم غرض ہر موقع پر طوائف کا وجود ناقابلِ فراموش تھا۔ اس دور کے بیشتر شعرا غمِ زمانہ کی صعوبتوں سے آزاد تھے۔ اس کے علاوہ خارجی زندگی میں اس قدر نیرنگیاں تھیں کہ ان کے کیف و سرور نے دل و دماغ پر ایک ایسا وجدان طاری کر دیا تھا جس نے زخم جگر کی ٹیسوں کو دبا دیا۔ عشق گم گشتگی کے بجائے وارفتگی پر مائل ہو گیا اب تک حسن کا نقش صرف قیاس کی مدد سے کھینچا جاتا تھا۔ اب حسن اپنے پورے جمال اور تابانیوں کے ساتھ سراپا نگاہوں کے سامنے موجود تھا۔ جذبات میں ولولے اور جوش پیدا ہوا اور حسن کا ذکر مبہم اشارات کے بجائے صاف الفاظ میں ہونے لگا یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ کی شاعری میں پہلی مرتبہ عورت کا تصور انتہائی واضح طور پر ہمارے سامنے آتا ہے۔ اگرچہ پرانی ادبی روایات کے مطابق محبوب کے ذکر کے لئے مذکر کا ہی صیغہ استعمال کیا گیا لیکن محبوب کے نقش و نگار، لباس وضع، عادات و اطوار اور لب و لہجہ وغیرہ کا ذکر جس ڈھنگ سے کیا گیا اس سے ہماری نگاہوں کے سامنے ایک نسوانی پیکر کا ہی تصور ابھرتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

وہ جب تک کہ زلفیں سنوارا کیا
کھڑا اس پہ میں جان وارا کیا (میر حسن)

بولا وہ سن کے شور مری آہ آہ کا
مشتاق یاں نہیں کوئی ایسوں کی چاہ کا (جرأت)

گر نازنیں کہے سے برا مانتے ہیں آپ
میری طرف بھی دیکھئے میں نازنیں سہی (انشا)

ایک شریف عورت کے مقابلے میں طوائف کا وصل آسان ہے اس لئے کہ یہاں جذب دل کے امتحان کی ضرورت نہیں بلکہ چلتے اور کھنکتے ہوئے سکے درکار ہیں یہاں انداز کوہ کنی کے بجائے شانِ خسروانہ کی ضرورت ہے جو ظاہر ہے کہ اول الذکر کے مقابلہ میں سہل ہے۔ ہجر کی گھڑیاں وصال کے لمحات میں تبدیل ہو گئیں نالۂ شب گیر کی جگہ ایک ڈبکی نے لے لی۔ شاعر نے زندگی عشق میں ایک نیا تجربہ حاصل کیا۔ اب فراق کی بے چینیوں کے بجائے لذتِ وصل کا ذکر ہونے لگا۔ حرمان و یاس کی جگہ ملاقات کی کیفیات کا بیان شروع ہوا جس کا نام معاملہ بندی رکھا گیا۔ چنانچہ میر کے اس خواب کی تعبیر کہ ؎ (باقی صفحہ ۱۰ پر)

[1] آبِ حیات صفحہ ۲۰۵

اداریہ

کام کا طریقہ

ہمارے یہاں اب تک قومی کام اس لئے کئے جاتے ہیں کہ ان کے ذریعہ سے یا تو محدود سیاسی مقاصد پورے ہوں، یا اشخاص کو نمود و نمائش کا موقع ملے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو خلوص کے ساتھ یہ کام کرتے ہیں اور انکا مقصد محض شہرت حاصل کرنا یا سستے سیاسی اغراض پورے کرنا نہیں ہوتا، مگر ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو خلوص سے کام کرتے ہیں، مگر کاموں کی تنظیم نہیں کر سکتے نہ وہ مختلف پہلوؤں پر پورا زور دے سکتے ہیں۔ کچھ لوگ ادبی کاموں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ انھیں مشاعرے کرنے، یوم منانے، شاعروں اور ادیبوں کے کارناموں کو سامنے لانے سے غرض ہے۔ یہ اچھی بات ہے، مگر یہی کافی نہیں۔ موجودہ دور میں اس کے علاوہ دوسرے کاموں کی طرف توجہ کی بھی ضرورت ہے، اس لئے ہماری شاخوں کو کئی قسم کے کارکن تلاش کرنا چاہئیں۔ اس وقت سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ابتدائی اور ثانوی مدارس میں حسب ضرورت اُردو کی تعلیم کا انتظام ہو۔ اساتذہ مہیا کئے جائیں۔ مناسب کتابیں کافی تعداد میں اور وقت پر مل جائیں۔ کالجوں میں اور یونیورسٹیوں میں جہاں جہاں ضرورت ہو اُردو ادب کی تعلیم کا انتظام ہو۔ جہاں انتظام ہے وہاں کسی تنگ نظری یا سستی کی وجہ سے یہ انتظام ختم نہ ہو۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ صرف اُردو داں اشخاص کو روزمرہ زندگی میں دقت نہ ہو۔ عدالتوں میں انھیں زحمت نہ پیش آئے۔ دفتروں میں اُردو میں عرضیوں پر غور ہو۔ اُردو کے اخباروں کی اشاعت بڑھے۔ اُردو کی کتابیں بڑی تعداد میں چھپیں اور بکیں۔ اخباروں اور کتابوں کی لکھائی چھپائی موجودہ مذاق کے مطابق ہو۔ یہ سب کام ایک قسم کے لوگ نہیں کر سکتے اس کے لئے کئی قسم کے کارکنوں کی ضرورت ہے۔ ان میں سے بہت سے کام ایسے ہیں جن سے نہ شہرت ملتی ہے نہ ذاتی فائدہ ہوتا ہے۔ ان میں ہنگامی پہلو بھی نہیں ہے۔ ان کے لئے نہ حکومت کے خلاف جہاد کرنے کی ضرورت ہے، نہ خواہ مخواہ حکومت کی پاسداری کی۔ اس لئے ہماری شاخوں اور اُردو کی انجمنوں کو چاہیے کہ اپنے اپنے کاموں کی نوعیت متعین کریں اور ان میں کچھ چیزوں کو پہلے اور کچھ کو بعد میں رکھیں۔ اب عام طور پر اُردو دشمنی کی فضا نہیں ہے۔ اُردو کی قومی حیثیت بھی مان لی گئی ہے۔ اب ضرورت ٹھوس کام کی ہے، جس کے نتائج فوراً نہیں نکل سکتے، مگر جس کی کامیابی مسلم ہے۔ ہر شکایت اخبار میں چھپوانے سے اتنا فائدہ نہیں ہوتا جتنا مقامی افسروں سے ملنے اور ان کے سامنے حالات رکھنے سے۔ ہماری شاخوں میں ہر سیاسی خیال کے اور ہر مذہب و ملت کے لوگ موجود ہیں۔ وہ اگر چند اہم کاموں کے سلسلے میں ذمہ دار اور متعلقہ اشخاص سے بات کریں گے اور یہ سلسلہ برابر جاری رکھیں گے تو کامیابی یقینی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ حکومتیں بھی سفارش یا مطالبے کو نہیں دیکھتیں یہ دیکھتی ہیں کہ اس کے پیچھے کتنی طاقت موجود ہے۔ یہ طاقت کام سے آئے گی۔ یہ طاقت اعداد و شمار جمع کرنے سے، معاملات کو صاف اور سلجھے ہوئے انداز سے پیش کرنے سے آئے گی۔ اگر اس میں مختلف خیال کے اور مختلف مذاہب کے لوگ شریک ہوں گے تو اس کی قومی حیثیت واضح ہوگی۔ اُردو دوستوں کو موجودہ فضا سے فائدہ اٹھا کر ہر سطح پر اُردو زبان و ادب کی ترقی کے لئے کام کرنا چاہیے اور یہ سمجھ کر کام کرنا چاہیے کہ معقول اور اچھے کام خود بخود نہیں ہو جاتے ان کے لئے بڑی جدوجہد کرنا پڑتی ہے مگر اس جدوجہد کا اچھا نتیجہ ضرور نکلتا ہے۔

ادھر ادھر سے

جموں کشمیر کلچرل اکیڈمی کا سہ ماہی جریدہ

ریاست میں دسمبر ۱۹۶۱ء سے ریاستی کلچرل اکیڈمی کے زیر اہتمام ایک سہ ماہی جریدہ شائع ہو رہا ہے اس میں کشمیر کی تاریخ و ادب سے متعلق تنقیدی مضامین شائع کئے جائیں گے۔

اس جریدہ کا مقصد یہ ہے کہ ریاست کے مختلف حصوں میں بسنے والوں اور ریاست کے باہر بھی بسنے والوں کو اطلاعات بہم پہنچائی جائیں۔

پاکستان میں اردو اور بنگالی کی کتابوں پر انعامات

پاکستان کی وزارت تعلیم نے اردو اور بنگالی کی دو دو کتابوں پر پانچ پانچ ہزار روپے انعام دینے کا اعلان کیا ہے۔ جن کتابوں کو انعام کے لئے منتخب کیا ہے وہ حسب ذیل ہیں:-

تلاش بہاراں یہ اردو کا ناول ہے اور اسکی مصنفہ جمیلہ ہاشمی ہیں

"اقبال" اردو کی تنقیدی کتاب ہے۔ "ایم پرس بنگالی کی کتاب ہے جس کے مصنف رشید کریم ہیں اور دوسری کتاب کنہیا کماری ہے جس کے مصنف عبدالرزاق ہیں۔

جشن اثر رامپوری

ادارہ ہمجر اردو ویلفیئر رامپور کے زیر اہتمام ۱۲-۱۳ نومبر ۱۹۶۱ء کو جشن اثر منایا جائے گا جس میں ان کے کارناموں کو خراج عقیدت پیش کیا جائے گا۔ محمد علی خاں اثر رامپوری اردو کے مشہور شاعر اور عالم ہیں ان کی ادبی اور علمی خدمات کے صلے میں انھیں حکومت ہند سے وظیفہ مل رہا ہے۔ اس موقع پر ایک ہمجر لیا پروگرام کا بھی انعقاد کیا جائیگا تاکہ اثر صاحب کی اہم تصنیف "تذکرہ شعرائے رامپور" کی اشاعت کے لئے روپیہ جمع کیا جا سکے۔

جشن ٹیگور کے سلسلے میں رقص کا میلہ

سنگیت ناٹک اکیڈمی کی طرف سے ۱۱ نومبر سے ۱۰ دسمبر تک رابندر ناتھ ٹیگور کے ڈراموں اور ڈانس ڈراموں کو پیش کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ ٹیگور کی صد سالہ سالگرہ کی تقریب کا دوسرا حصہ ہے۔ اس میلہ میں شرکت کے لئے ملک کے مشہور و معروف تھیٹر گروپ کو دعوت دی گئی ہے۔ اس میں ہندوستان کے چار کلاسیکل رقص، بھرت ناٹیم، کتھا کلی، کتھک اور منی پوری کے ذریعے ٹیگور کی تخلیقات پیش کی جائیں گی۔

ہندوستان کے پانچ شہروں میں کتابوں کا قومی میلہ

"کتابوں کی حوصلہ افزائی کے ہفتہ" کے دوران جو ۱۴ سے ۲۰ نومبر تک ہندوستان کے پانچ شہروں دہلی، بمبئی، مدراس، وارانسی اور کلکتہ میں منایا جائے گا۔ کتابوں کا قومی میلہ بھی منایا جائے گا۔ حکومت ہند کی اپیل پر آل انڈیا ہندی پبلشرز ایسوسی ایشن نے اس میلہ کے انتظامات کی ذمہ داری قبول کی ہے۔ اس موقع پر کتابوں کی صنعت اور ہندوستان میں اس کی اہمیت کے علاوہ مصنفوں اور ناشروں کے تعلقات اور اس قسم کے دیگر موضوعات پر سیمینار منعقد ہوں گے۔ توقع ہے کہ اس میلہ میں "یونیسکو" حکومت ہند اور ریاستی حکومتیں حصہ لیں گی۔

کالجوں میں گاندھی جی کے نظریہ کی تعلیم

تعلیمی اداروں میں گاندھی جی کے عقائد اور طرز زندگی کو فروغ دینے کی اسکیم کے تحت مرکزی وزارت تعلیم خود گاندھی جی کی انگریزی تصانیف یا دیگر سربرآوردہ اشخاص کی لکھی ہوئی کتابوں کے سٹ یونیورسٹیوں اور منتخبہ کالجوں کو مفت فراہم کرے گی۔ وزارت نے ایسے ناشروں، کتب فروشوں اور مصنفین سے کتابوں کی ایک جلد طلب کی ہے جو اپنی مطبوعات کو اس سلسلے میں غور کئے جانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ بھارت سرکار اس سلسلے میں ایک کمیٹی مقرر کرے گی جو حکومت کے خریدنے کے لئے کتابیں منتخب کرے گی۔ وزارت نے طے کیا ہے کہ کتابیں انگریزی میں ہونی چاہئیں کہ کالج کے طلبہ ان میں دلچسپی لے سکیں اور ان میں تعلیمی خصوصیت بھی ہو تاکہ طلبہ میں گاندھی جی کے خیالات کا صحیح شعور پیدا ہو سکے۔ کتابوں کے بارے میں پیش کردہ تفصیلات میں کتاب کا نام مصنف اور ناشر کا نام، چھپی ہوئی قیمت، چھپی ہوئی قیمت میں کمی، کم کی ہوئی قیمت پر کٹوتی اور خالص قیمت بھی شامل کی جائے۔ مطبوعات کی کاپیاں اور تفصیلات وزارت تعلیم میں بھارت سرکار کے اسسٹنٹ مشیر تعلیم شری ایم۔ پی۔ جین ۱۰ ایم بلاک نئی دہلی کے نام پر ۱۵ نومبر ۱۹۶۱ء تک بھیجی جائیں۔

آکسفورڈ یونیورسٹی میں مشرقی علوم کا نیا انسٹی ٹیوٹ

آکسفورڈ یونیورسٹی میں مشرقی علوم کا ایک نیا انسٹی ٹیوٹ قائم کیا گیا ہے جہاں طلبہ کو ریسرچ کے زیادہ اور بہتر مواقع حاصل ہوں گے۔ نئے انسٹی ٹیوٹ میں ۳۰۰ تا ۴۰۰ طلبہ کو تعلیمی سہولتیں دی جا سکیں گی۔ ماضی میں تقریباً ایک سو طلبہ کے لئے گنجائش تھی۔ اور ان کو دس مختلف عمارتیں استعمال کرنا پڑتی تھیں۔ یہ تعلیمی سہولیات بھی ناکافی تھیں۔ نیا بلاک چار منزلہ ہے۔ انسٹی ٹیوٹ میں ایک بہت بڑی لائبریری کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔

بلگیریا کے مشہور مصوّر کی لکھنؤ میں آمد

بلگیریا کے مشہور مصور مسٹر این۔ ایس۔ پٹکوف جن کو مرکزی حکومت نے ہندوستان کا دورہ کرنے کی دعوت دی ہے۔ ۳۱ اکتوبر کو لکھنؤ پہنچ رہے ہیں جہاں وہ دو دن قیام کریں گے۔ مسٹر پٹکوف صوفیہ کی فنون لطیفہ اکیڈمی کے گریجویٹ ہیں اور ایک مشہور مصور ہیں ۱۹۵۳ء سے ان کی تصاویر کی کئی نمائشیں منعقد ہوئی ہیں۔ علاوہ ازیں مختلف قومی اور بین الاقوامی نمائشوں میں بھی انکی تصاویر رکھی گئی ہیں۔ ۱۹۵۵ء میں وارسا میں یوتھ فیسٹول کے موقع پر منعقد کی گئی بین الاقوامی نمائش میں مسٹر پٹکوف کو دوسرا انعام ملا۔ یوگوسلاویہ کی بین الاقوامی نمائش کے علاوہ ماسکو میں منعقد سوشلسٹ ممالک کی بین الاقوامی نمائش میں بھی انکی تصاویر رکھی گئیں۔ مسٹر پٹکوف بلگیریا کے فنکاروں کی یونین کے سرگرم ممبر ہیں اور اس وقت اس یونین کے سکریٹری ہیں۔

یوگوسلاویہ کے ناول نگار کو ادب کا نوبل انعام

اسٹاک ہوم۔ ۲۶ اکتوبر سنہ ۱۹۶۱ء کا ادب کا نوبل انعام یوگوسلاویہ کے ناول نگار آیوو اندرک کو دیا گیا ہے انعام کی رقم ۴۸۳۰۰ ڈالر ہے دوسری عالمی جنگ کے آغاز کے موقع پر وہ جرمنی میں یوگوسلاویہ کے سفیر تھے۔ ان کے اہم ناولوں کا ترجمہ انگریزی میں ہوچکا ہے۔ ان کی عمر اس وقت ۶۹ سال ہے۔

غزل

آفتاب شمسی

ان کی الفت کے نظر آتے ہیں افسانے چند
کوئے جاناں میں جو بیٹھے ہیں یہ دیوانے چند
اب کہیں کس سے کہ کس نے ہمیں برباد کیا
ان میں اک اپنا ہے اور ساتھ ہیں بیگانے چند
دیکھ کر کالی گھٹا خود بھی کہیں کے نہ رہے
آج زہاد چلے تھے ہمیں سمجھانے چند
شمع کے جلنے نہ جلنے سے کوئی فرق نہیں
اپنی ہی آگ میں جل جاتے ہیں پروانے چند
تشنگی ان کی قیامت نہ اٹھا دے ساقی
یہ جو میخوار نظر آتے ہیں من مانے چند
ان گنت غم مری قسمت میں ہیں لیکن شمسی
ان غموں کے لئے ہیں شہر میں میخانے چند

غزل

ناصر شہزاد

چاہت کا پیمانہ پی لے
جیون رُت جاتی ہے جی لے
اُف یہ پسینہ تیری جبیں پر
تارے چمکے گیلے گیلے
تجھ کو دیکھ کے یاد آتے ہیں
کھلتے موسم۔ دن چمکیلے
پنگھٹ پنگھٹ آنچل لہکیں
لال، گلابی، نیلے، پیلے
یاد آئیں تو سُدھ بسرائیں
نین کسی کے نین نشیلے
اَن دیکھی خوشیوں کے سپنے
دور وہ اونچے اونچے ٹیلے
پریت کے بندھن کتنے انوکھے
ہم لب بستہ۔ تم شرمیلے
اپنا غم تھا یا دکھ جگ کا
یاد کیا تجھ کو ہر حیلے
ڈوبتے دل کی دھڑکن ناصر
بن جاتی ہے گیت رسیلے

غزل

سلام نوری

اپنا ہم حالِ دلِ زار سنائیں کس کو؟
کوئی مونس بھی نہیں کوئی شناسا بھی نہیں
تیرے دامن میں ہیں غم کتنے اے فرخندہ حیات
میں نے نزدیک سے تجھ کو ابھی دیکھا بھی نہیں
میں کہوں کیسے؟ کبھی تجھ سے محبت بھی رہی
دل مرا یاد میں تیری کبھی رویا بھی نہیں
عالم عشق میں ایسا بھی ہوا ہے محسوس
کوئی اپنا بھی نہیں کوئی پرایا بھی نہیں

راشٹریہ گیت

از بھارتی

آؤ! ہم سب سیس جھکائیں
جے ہو بھارت! جے ہو!!
آؤ! ہم سب سیس جھکائیں
جے ہو بھارت! جے ہو!!
اُتر میں کشمیر، ہماچل، یو۔پی، آنکھ کا تارا
دکھشن میں آندھرا، کرناٹک، کیرل، دیش پیارا
پورب میں بنگلا، آسام، اڑیسا اور بہارا
پچھم میں پنجاب، بمبئی، راجستھان ہمارا
جے ہو، جے ہو، بھارت! جے ہو!!
آؤ! ہم سب سیس جھکائیں
جے ہو بھارت! جے ہو!!

•

گنگا، جمنا، برہم پترا، مدھر گیت سنائیں
کاویری، چمبل اور کرشنا، میٹھے نغمے گائیں
راوی، ستلج، گھاگھرا، سرجو، سورگ کی شان بڑھائیں
مہاندی، گوداوری ندیاں، دیش کا مان بڑھائیں
جے ہو، جے ہو، بھارت! جے ہو!!
آؤ! ہم سب سیس جھکائیں
جے ہو بھارت! جے ہو!!

•

ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، سب ہیں سیوک تیرے
نس نس میں گاندھی کی اہنسا، ہم ہیں اہنسک تیرے
وقت پڑے پر ڈٹ جائیں ہم، وہ ہیں رکھشک تیرے
رن بھومی میں کبھوں نہ ہاریں، شیر ہیں بیٹے تیرے
جے ہو، جے ہو، بھارت! جے ہو!!
آؤ! ہم سب سیس جھکائیں
جے ہو بھارت! جے ہو!!

غزل

صلاح الدین نیر

اعجاز حسن ہے کہ نظر کا فریب ہے
آسودۂ جمال کبھی ہم نہ ہو سکے
موتی بنے، شرر بنے، شبنم بنے کبھی
آنسو ہمارے وقفِ شبِ غم نہ ہو سکے
منزل بھی ساتھ ساتھ تھی جب آپ ساتھ تھے
تنہا چلے تو فاصلے پھر کم نہ ہو سکے
گو زندگی نے کتنے ہی دھوکے دیئے مگر
مایوس زندگی سے کبھی ہم نہ ہو سکے
بھیگی شبوں میں ہم نے جلائے تھے جو دیئے
وہ آندھیوں کی زد میں بھی مدھم نہ ہو سکے
نیر اک ان کا غم ہی نہیں حاصلِ حیات
کچھ اور غم بھی ہیں جو فراہم نہ ہو سکے

مراسلات

"اُردو کے چند کوزی تجصوتیے"

ہماری زبان یکم و ۱۵ اگست سنہ ۱۹۷۱ء میں ڈاکٹر گیان چند کا مضمون "اردو کے چند کوزی تجصوتیے" نظر سے گزرا۔ مجھے ڈاکٹر صاحب کے پیش کردہ تجزیے سے مکمل اتفاق ہے۔ ان کی دی ہوئی امثال سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ اُردو میں "ڈھ" اور "ڑھ" آزاد تجصوتیے ہیں۔ یہ میرے مطالعے کی کمزوری تھی کہ ان امثال تک میری نظر نہ پہنچ سکی۔ البتہ ایک بات میں اپنے مضمون (اُردو کے کوزی تجصوتیے) کے بارے میں عرض کرنا چاہوں گا۔ اس مضمون کا صرف ایک مقصد تھا اور وہ یہ کہ تجصوتیات کے اصولوں کو اُردو زبان میں ایک آسان شکل میں پیش کر دیا جائے، اور اس طرح لسانیات کی اصطلاحات کے سلسلے میں بھی کچھ کام ہو جائے۔ بہر حال مجھے خوشی ہے کہ محترم ڈاکٹر صاحب نے اس طرف توجہ کی اور میرے مضمون سے جو غلطیاں پیدا ہو سکتی تھیں وہ رفع کر دیں، اور بعض دوسرے اہم اصولوں کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی۔

[چودھری محمد نعیم (امریکہ)]

شکریہ تصحیح کے جواب میں

۲۲ ستمبر ۱۹۷۱ء کے ہماری زبان میں "شکریہ تصحیح" کے عنوان سے جو مضمون مولوی حامد حسن قادری صاحب کا شائع ہوا ہے ہماری نظر سے گزرا۔ جواباً التماس ہے کہ میری عمر اسّی وہ بر اسّی سال سے تجاوز کر گئی ہے۔ بینائی میں فرق آ گیا ہے۔ چونکہ ساٹھ باسٹھ سال سے کتب بینی کی لت لگی ہوئی ہے اور تاریخ داستان اُردو سے مجھ کو دلچسپی ہے اسی لئے اکثر کتاب مذکور کو ادھر اُدھر سے الٹ پلٹ کر دیکھا کرتا ہوں اور جو اغلاط دوران مطالعہ میں نظر آتے ہیں ان کو لال پنسل سے نشان دے دیتا ہوں۔

"تاریخ داستان اُردو" جیسی ضخیم کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کر کے کل اغلاط کی نشاندہی کرنا میرے لئے بہت دشوار ہے سرسری دوران مطالعہ میں دو غلطیاں اور ملی ہیں جو ہدیہ ناظرین ہیں۔

(۱) ص ۱۴۵ حاشیہ :-

سنہ ۱۹۰۱ء میں جب شیخ عبدالقادر صاحب نے لاہور سے

رسالہ مخزن جاری کرنے کا اعلان کیا تو ....

....

رسالہ مخزن لاہور کا پہلا نمبر اپریل سنہ ۱۹۰۱ء میں شائع ہوا تھا (ملاحظہ ہو دیباچہ بانگ درا از شیخ عبدالقادر صاحب) شیخ صاحب موصوف نے سب سے پہلے ندوۃ العلما کے اس جلسے میں اعلان کیا تھا جو عظیم آباد پٹنہ میں سنہ ۱۹۰۰ء کے آخر یا سنہ ۱۹۰۱ء کے شروع میں منعقد ہوا تھا۔ اس کے بعد دسمبر سنہ ۱۹۰۰ء ندوی ہیں ندوۃ العلما کا جلسہ کلکتے میں منعقد ہوا تھا۔ میں خود کلکتے کے اس جلسے میں اپنے عزیز دوست مولوی سید عبدالنعیم دسنوی کی معیت میں شریک تھا۔ شیخ عبدالقادر صاحب نے میرے سامنے اس جلسے میں بھی رسالۂ مخزن کو اپریل سنہ ۱۹۰۱ء سے جاری کرنے کا اعلان کیا تھا۔ کلکتے کے اسی جلسے میں مولانا عبدالحق حقانی، جسٹس سید امیر علی بالقابہ، نواب سید امیر حسن بھاگلپوری پریسیڈنسی مجسٹریٹ کلکتہ، مولوی شمس الہدے کلکتہ ہائی کورٹ کے نامی وکیل (جو بعد میں کلکتہ ہائی کورٹ کے جج بھی ہو گئے تھے) کی زیارت سے مشرف ہوا تھا۔ اس لحاظ سے سنہ ۱۹۰۲ء کی جگہ پر سنہ ۱۹۰۱ء ہونا چاہئے۔

(۲) ص ۲۴۶ :-

مولانا حالی .... کی تصانیف

نثر بہ ترتیب تصنیف یہ ہیں

(۸) سوانح عمری حکیم ناصر خسرو (۱۸۸۲ء / ۱۳۰۰ھ) اب نایاب ہے۔

میرے علم میں مولانا حالی کی تالیف یا تصنیف سے اس نام کی کوئی کتاب نہیں ہے۔ سنہ ۱۸۸۲ء کے پہلے ہی سے مولانا اینگلو عربک اسکول دہلی میں السنہ شرقیہ کے مدرس اول تھے۔ اُسی زمانہ میں مولانا کو حکیم ناصر خسرو علوی بلخی کے سفرنامہ کا ایک قلمی نسخہ نواب ضیاء الدین خاں صاحب نیر رخشاں کے کتب خانے سے دستیاب ہوا تھا۔ جہاں سے فرانس کے مشہور مصنف چارلس شیفر نے اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں شائع کیا تھا۔ یہ قلمی نسخہ اصل میں اکبر بادشاہ کے رضاعی بھائی مرزا عزیز کے کتب خانے کا تھا۔ مولانا حالی نے اسی فارسی سفرنامہ کو مرتب کر کے سنہ ۱۸۸۲ء میں دہلی سے شائع کیا تھا تو اس کے ساتھ حکیم ناصر خسرو کی سیرت بھی فارسی نثر میں لکھ کر شامل کر دی تھی۔ یہ سیرت سفرنامہ کے پہلے ۳۲ صفحوں میں درج ہے۔ اس فارسی سفرنامہ کا اُردو ترجمہ مترجمہ مولوی عبدالرزاق کانپوری مصنف البرامکہ و نظام الملک طوسی وغیرہ سنہ ۱۹۴۱ء میں انجمن ترقی اُردو ہند کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔ مولانا حالی کے مرتب کردہ فارسی سفرنامے کا ایک نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے۔ نایاب نہیں ہے۔ (محمد بشیر الحق دسنوی بہاری)

انجمن کا خبر نامہ

اردو قومی یکجہتی کی ایک بہترین مثال ہے

نئی دہلی۔ ۱۹ر اکتوبر۔ وزیر اعظم پنڈت نہرو نے کہا کہ اردو قومی یکجہتی کی ایک بہترین مثال ہے جس نے لوگوں کے قریب آنے میں بڑی مدد کی۔

انھوں نے یہ بات اردو اخبارات اور کتابوں کی نمائش کا وگیان بھون میں افتتاح کرتے ہوئے کہی۔ انھوں نے کہا کہ اردو کو ریاستی حکومتوں کو اگرچہ وہ امداد نہیں دی جتنی کہ دینی چاہئے تھی، لیکن پھر بھی اردو نے آزادی کے بعد سے کافی ترقی کی اس سے اس زبان کے جاندار ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ اردو ہندوستان کی زندگی کا ایک اہم جز ہے اسکی ہر ممکن طریقہ پر ہمت افزائی کی جانی چاہیئے۔

پنڈت نہرو نے اپیل کی کہ اردو، ہندی اور دوسری زبانوں کو اپنے علاقہ کی عام بول چال کی زبان سے زیادہ سے زیادہ قریب آنا چاہیے انھوں نے کہا کہ بنگالی، مرہٹی، گجراتی اور تامل عام بول چال کی زبان سے بہت قریب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بڑی مقبولیت حاصل کی۔ اردو بھی بڑی حد تک عوام کی زبان سے قریب ہے۔ ہندی کو ابھی عام بول چال کی زبان سے قریب آنے کے لئے بہت کچھ کرنا ہے۔

وزیر اعظم پنڈت نہرو نے اپنی تقریر میں کہا کہ یہ اچھی بات ہے کہ آزادی کے بعد سے اردو میں نکلنے والے اخبارات کی تعداد دگنی ہوگئی ہے لیکن اس معاملہ میں صرف تعداد زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ انھوں نے کہا کہ بنگالی، مرہٹی، گجراتی اور تامل اخبارات عوام سے بہت قریب آگئے ہیں اور انھوں نے ان پر بہت کچھ اثر ڈالا ہے کیونکہ وہ عام بول چال کی زبان سے بہت قریب ہیں لیکن اردو کے اخبارات ابھی اتنے قریب نہیں آئے ہیں اور ہندی کے اخبارات تو ابھی بہت دور ہیں۔

وزیر اعظم پنڈت نہرو نے کہا کہ یہ زمانہ عوام کا زمانہ ہے خواص کا نہیں ہے۔ اخبارات کے ایڈیٹروں کو مغربی ممالک میں اخبارات میں جو انقلاب آیا ہے اس سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ ان ملکوں میں تعلیم کے عام ہونے کے بعد سے اخبارات نے اپنی زبان عوام کی زبان سے قریب کردی اور ان کی دلچسپی کی چیزیں شائع کرنے لگے اور عوام میں مقبول ہو گئے۔ یہ تبدیلی ہندوستان میں بھی ہو رہی ہے لیکن اس کی رفتار بہت سست ہے اس کو اور تیز ہونا چاہیئے اور اس رجحان کی ہمت افزائی ہونی چاہیئے۔

پنڈت نہرو نے کہا کہ بنگالی زبان کے مشہور ادیب و شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کی مقبولیت کا یہی راز تھا کہ ان کے گیت اور کہانیاں عام فہم ہوتی تھیں اور بالکل اسی زبان میں ہوتی تھیں جو عام لوگ بولتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے گیت بنگال کے دیہاتوں میں گائے جاتے ہیں اور عام لوگ ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اگر ہندی، اردو کو عوام کی بول چال کی زبان سے قریب لایا جائے تو وہ بہت جلد ترقی کرسکتی ہے۔

وزیر اعظم پنڈت نہرو نے کہا کہ جہاں تک قومی یکجہتی کا سوال ہے اردو زبان نے اس سلسلہ میں بڑی خدمات انجام دی ہیں اور مختلف فرقوں کو قریب لانے میں بڑی مدد کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان میں ستر فی صدی الفاظ ہندی اور سنسکرت کے ہیں باقی تیس فی صدی الفاظ عربی، فارسی اور ترکی زبانوں سے لئے گئے ہیں اور انھیں اپنا لیا گیا ہے وہ زبان جو باہر سے نئے الفاظ نہیں لیتی وہ تیز ترقی نہیں کرسکتی اگر زبان کو خالص رکھنے کی کوشش کی جائیگی تو وہ سوکھ کر رہ جائے گی۔

پنڈت نہرو نے کہا کہ تاریخ بتاتی ہے وہ قومیں جو اپنے دماغوں، ذہنوں کی کھڑکیاں اور دروازے کھلے رکھتی ہیں اور دوسرے ملکوں اور قوموں کے تازہ خیالات کو آنے کی اجازت دیتی ہیں وہی دنیا میں ترقی کرتی ہیں یہی حال زبانوں کا ہے۔

انھوں نے کہا کہ اردو میں تازگی اور طاقت صرف اس لئے ہے کہ اس نے دوسری زبانوں سے الفاظ اور خیالات لئے ہیں اور اپنے دامن کو تازہ پھولوں سے مالا مال کیا ہے۔ اردو زبان میں انگریزی کے الفاظ ہندی کے مقابلہ میں زیادہ لئے گئے ہیں۔ اردو ہندوستان کی یکجہتی کی ایک اچھی مثال ہے اس میں نہ صرف زبان کی یکجہتی پائی جاتی ہے بلکہ ذہن، خیالات، تہذیب اور ادب کی یکجہتی پائی جاتی ہے۔

ہندی اردو میں رابطہ

وزیر اعظم پنڈت نہرو نے زور دیتے ہوئے کہا کہ ہندی اردو میں قریبی رابطہ کی ضرورت ہے اور انھیں ایک دوسرے کو متاثر کرنا چاہیئے انھوں نے کہا کہ اگر انھیں اردو کی ترقی کی فکر نہ ہوتی تب بھی ہندی کی ترقی کے لئے اردو سے رابطہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح اردو کو ہندی کی ضرورت ہے۔ ان دونوں کی جڑ ایک ہے۔ ان دونوں کو اپنی اپنی خصوصیات کے مطابق ترقی کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے قریب آنا چاہیئے اور ایک دوسرے کو متاثر کرنا چاہیئے۔

انھوں نے کہا کہ جہاں تک سائنس اور دوسرے فنون کی اصطلاحی الفاظ کا تعلق ہے ان کے لئے نئے نئے الفاظ گڑھنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ وہ بیرونی زبانوں سے لئے جائیں اور ان میں ضرورت کے مطابق معمولی تبدیلی کرکے تمام ہندوستانی زبانوں میں یکساں طور پر استعمال کئے جائیں۔

روداد جلسۂ عاملہ انجمن ترقی اردو شاخ گلبرگہ

انجمن ترقی اردو شاخ گلبرگہ کی مجلس عاملہ کا جلسہ بتاریخ ۵ر اکتوبر ۶۱ء زیر صدارت سید مبارز الدین صاحب رفعت منعقد ہوا۔ سب سے پہلے تنظیمی مسائل کا جائزہ لیا گیا اور بعد میں نئے اراکین کا انتخاب ہوا۔ جناب عبدالقادر صاحب ادیب [illegible] انجمن چنے گئے اور شری ترمل راؤ ویشنائی رکن عاملہ منتخب ہوئے۔ جناب برکت الحق قریشی [illegible] صدر انجمن کے ذمے ادبی محفلوں کے انعقاد اور مراسلت وغیرہ کا کام تفویض کیا گیا۔

مرکزی انجمن کی ہدایات پر اظہار خوشنودی کرتے ہوئے

عاملہ نے مرکز اور شاخوں کے ربط کی اہمیت کو محسوس کیا۔ جلسے میں انجمن کی سابقہ یک سالہ سرگرمیوں کا جائزہ لیا گیا جن میں مردم شماری سے متعلقہ امور اور مختلف تعلقوں میں مدارس کے قیام کی تحریکیں قابلِ ذکر ہیں۔ عاملہ نے اس بات پر بطور خاص اظہار مسرت کیا کہ حکومت میسور نے انجمن کے مدارس کے آغاز کے سلسلے میں پیش کردہ چند اہم مطالبات کو منظور کیا۔

انجمن کی آئندہ مصروفیات کے سلسلے میں یہ طے پایا کہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو مجلس عاملہ کا ایک جلسہ بلایا جائے اور ہر تیسرے شنبے کو انجمن کی جانب سے ایک ادبی محفل منعقد ہو۔

مرکزی انجمن کے آرگن "ہماری زبان" کی خریداری کو مقبول بنانے کے لئے مجلس عاملہ کے اراکین نے خریداری کے لئے اپنے نام پیش کئے اور ایک ذیلی کمیٹی تشکیل دی جس کے ذمے شہر میں اس مہم کو مقبول بنانے کا کام سونپا گیا۔ اسی ذیلی کمیٹی کے تحت انجمن کی عام رکنیت سازی کی مہم بھی ہے۔ (نائب صدر)

کریم نگر میں یوم سرسید

کریم نگر۔ ۲۰ر اکتوبر سنہ ۱۹۶۱ء

انجمن ترقی اردو شاخ ضلع کریم نگر کی جانب سے ہندوستان کے عظیم مصلح، مسلم، مدبر اور محسن سرسید احمد خاں مرحوم کی ۱۴۴ ویں سالگرہ کے موقع پر "یوم سرسید" کے عنوان سے بتاریخ ۱۷ر اکتوبر بروز منگل، بوقت ۹ ساعت شب، بمقام مدرسہ فوقانیہ جدید کریم نگر، بصدارت جناب سید حبیب الرحمٰن صاحب حبیب ایک "سمپوزیم اور غیر طرحی مشاعرہ" منعقد کیا گیا۔

سمپوزیم:۔ "یوم سرسید" کے سمپوزیم کا افتتاح مولوی عبدالجلیل صاحب کی تقریر سے عمل میں آیا، جناب اندر سروپ صاحب نے "سرسید اور ان کی تحریک" جناب ایم۔ اے۔ غفار صاحب لکچرار کالج نے "سرسید اور ان کے علمی و قومی کارنامے" اور جناب سید حبیب الرحمٰن صاحب حبیب نے "مختصر حالات سرسید" کے عنوان سے اپنے مقالے سنائے۔

تعزیتی قرارداد:۔ سمپوزیم کے بعد جناب ابوالکلام غازی الدین کمال کریم نگری صاحب معتمد انجمن ترقی اردو شاخ ضلع کریم نگر نے ہندی کے عظیم شاعر پنڈت سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا کے انتقال پر اپنے گہرے دلی رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے ایک تعزیتی قرارداد پیش کی جو منظور کرالی گئی اور حاضرین جلسے نے دو منٹ خاموش کھڑے ہو کر خراج عقیدت پیش کیا۔

مشاعرہ:۔ اس کے بعد غیر طرحی مشاعرہ کی کارروائی کا آغاز ہوا جس میں مقامی شعراء نے اپنا کلام سنایا۔ رات کے ۱۲ بجے معتمد صاحب انجمن ترقی اردو شاخ ضلع کریم نگر کے شکریہ کے ساتھ پروگرام کا اختتام عمل میں آیا۔ پروگرام کے انتظامات کے سلسلے میں جناب ٹی۔ آر۔ نرسمہا صاحب ہیڈ ماسٹر مدرسہ فوقانیہ جدید کریم نگر، محمد قاسم صاحب مددگار مدرس و دیگر مدرسین کا جذبہ اور کوششیں لائق ستائش رہیں۔

(ابوالکلام غازی الدین کمال، معتمد شاخ کریم نگر)

"بزم جگر" تروچراپلی

بزم جگر کا افتتاحی جلسہ ۱۴ر اکتوبر ۶۱ء بمقام قومی خدمتگار شپ میں ۹ بجے زیر صدارت سید عبدالغنی صاحب منعقد ہوا۔ بزم جگر کی مجلس عاملہ کے لئے ذیل کے عہدہ داروں کا انتخاب عمل میں آیا۔

صدر: مولوی سید عبدالغنی صاحب قاضی بلدہ۔
نائب صدر: شیخ داؤد فانی اور ایم۔ احمد بادشاہ ایم۔ اے۔
سکریٹری: احمد حسین حیدر۔
نائب معتمدین: سید غوث شاد اور حسین شریف انور۔
خازن: ذکی زیبائی۔

صدر جلسہ نے اپنی صدارتی تقریر میں اردو زبان کی ہمہ گیری مقبولیت اور اس کے لٹریچر پر روشنی ڈالی اور رئیس المتغزلین حضرت جگر مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا۔

آخر میں مختصر مشاعرہ ہوا جس میں مقامی شعراء نے حصہ لیا۔
(شیخ داؤد فانی۔ نائب معتمد "بزم جگر")

انجمن نوجوان مصنفین۔ بمبئی

انجمن نوجوان مصنفین کا انتخابی اجلاس اتوار مورخہ ۱۵ر اکتوبر ۶۱ء کو ۶ بجے صدر انجمن جناب موہن ناتھ صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ سب سے پہلے سابق سکریٹری نعیم سین نے انجمن کی سالانہ رپورٹ پڑھ کر سنائی جو منظور ہو گئی۔ اسکے بعد انجمن کی مجلس عاملہ کے لئے مندرجہ ذیل اراکین اور عہدہ دار متفقہ طور پر منتخب ہو گئے۔

موہن ناتھ۔ صدر، حمید سہروردی، سکریٹری، سلیمان ظفر، جوائنٹ سکریٹری، اختر راہی۔ خازن، اراکین: نعیم سین، حسن عباس فطرت، اسرار جدی، رحمٰن کلامی، عنایت اختر، مرزا عزیز جاوید۔ (سلیمان ظفر، جوائنٹ سکریٹری)

سالانہ مشاعرہ ڈی۔ اے۔ وی۔ کالج سیوان

بزم ادب کا سالانہ مشاعرہ ۱۵ر اکتوبر ۶۱ء بروز اتوار کالج کے احاطہ میں اعلیٰ پیمانے پر منعقد ہوا۔ مشاعرہ میں مقامی اور بیرونی شعراء کافی تعداد میں شریک ہوئے۔ مشاعرہ کی صدارت ذوالحسنین صاحب منسٹر آف ٹرانسپورٹ گورنمنٹ آف بہار نے فرمائی۔ وزیر موصوف نے اپنی صدارتی تقریر میں تمامی حاضرین کے ساتھ کھڑے ہو کر اردو کے محسن حضرت دل شاہجہاں پوری، شاہ تغزل حضرت جگر مرادآبادی اور بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق کی وفات حسرت آیات پر دلی رنج و غم کا اظہار ایک منٹ خاموشی کے ساتھ کیا۔

بعد ازاں پروفیسر عبدالحمید صدر بزم ادب نے وزیر موصوف کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا۔ صدر جلسہ نے تمامی اراکین بزم ادب خصوصاً پروفیسر عبدالحمید صدر بزم ادب کے حسن انتظام کی تعریف کی اور ایک گرانقدر عطیہ مبلغ ۲۵۱ روپیہ کا اپنی جانب سے اعلان فرمایا۔ شعرائے کرام کے کلام کو حاضرین جلسہ نے پرسکون طریقے سے سنا۔ مشاعرہ ۸ بجے شب میں شروع ہوا اور نہایت ہی کامیابی کے ساتھ ۲ بجے شب میں ختم ہوا۔ صدر بزم ادب نے آخر میں حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔

(سید صغیر [illegible] رضوی۔ سکریٹری بزم ادب)

گزشتہ سے پیوستہ

بھارت میں اُردو صحافت کی تاریخ و ترقی

"صادق الاخبار" (۱۸۵۶ء)، منشی بہاری لال مشتاق کا اخبار "اکمل الاخبار" (۱۸۶۶ء)، "نصیر الاخبار" (۱۸۷۶ء)، مولوی نصرت علی کا "نصرت الاسلام" (۱۸۷۶ء)، منشی مہا نارائن کے "مفید الہند" اور "خیرخواہ ہند" (۱۸۷۷ء)، منشی بالک داس کا "صحیفۂ ہند" (۱۸۷۸ء) اور مولوی سید احمد کا اخبار "تماشائی" "الفساد" اس زمانے کے دہلی کے قابل ذکر اخبارات تھے۔ اسی طرح منشی نول کشور کا "اودھ اخبار" (۱۸۵۸ء)، انجمن اودھ کا "بھارت بندھو" (۱۸۶۷ء)، "کوکب ہند" (۱۸۷۷ء)، "مرقع تہذیب" (۱۸۷۳ء)، منشی پورن چند کا اخبار "تماشائی" (۱۸۷۶ء)، محمد تیغ بہادر کا "انوار الاخبار" (۱۸۷۶ء)، منشی سجاد حسین کا "اودھ پنچ" (۱۸۷۷ء) وغیرہ لکھنؤ سے شائع ہوئے۔ میرٹھ سے وجاہت علی خاں کا "اخبار عالم" (۱۸۶۶ء)، مولوی محمد حیات کا "نجم الاخبار" (۱۸۷۳ء)، سید جمیل الدین کا "لارنس گزٹ" (۱۸۷۳ء)، اور مولانا شوکت حسین کا "شان ہند" (۱۸۸۷ء) شائع ہوتے تھے۔ لاہور سے "پنجابی اخبار" (۱۸۶۵ء)، اخبار "انجمن پنجاب" (۱۸۷۰ء) اور سنتو رام دتہ کا "ریفارمر" (۱۸۸۲ء) شائع ہوتے تھے۔ ۱۸۸۰ء تک تین اردو روزنامے "اودھ اخبار"، "روزانہ اخبار" اور "پیسہ اخبار" شائع ہونے لگے تھے۔ "اودھ اخبار" میں وزیر علی شوق اور گنگا سہائے کے کارٹون بھی شائع ہوتے تھے۔ "کوہ نور" (۱۸۵۰ء)، "اخبار عام" (۱۸۷۱ء) اور "اودھ پنچ" (۱۸۷۷ء) کی آراء کو بھی عوامی اور سرکاری دونوں حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

اس دور کے ابتدائی عرصے میں اُردو اخبار نویسی پر سوامی دیانند اور سید احمد خاں کے اصلاحی رجحانات کا کافی اثر تھا۔ سیاسیات، تاریخ، تعلیم اور تہذیب سے متعلق مسائل اُردو اخبارات میں زیر بحث آنے لگے۔ اُردو اخبارات اگرچہ بالعموم وفاداری کی پالیسی پر عمل پیرا رہے لیکن اس عرصے سے متعلق بعض اہم پبلک مسائل پر وہ لوگوں کے مطالبات اور جذبات کی ترجمانی کرنے لگے۔

تیسرا دور

اُردو اخبار نویسی کے تیسرے دور کی ابتدا موجودہ صدی کے آغاز سے ہوئی۔ ان دنوں قریباً [illegible] اُردو اخبارات باقاعدگی سے شائع ہوتے تھے جن میں سے زیادہ تر اخبارات ہفتہ وار یا پندرہ روزہ تھے۔ ۱۹۰۴ء میں تین اُردو روزنامے "اودھ اخبار" (۱۸۵۸ء)، "پیسہ اخبار" (۱۸۸۷ء) اور "صلح کل" (۱۹۰۰ء) شائع ہو رہے تھے۔

۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے اور ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے وجود میں آنے سے قومی بیداری کو تقویت پہنچی۔ الہ آباد سے شائع ہونے والے اخبار "اردوئے معلیٰ" نے قومی پالیسی کو اپنایا۔ ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو مولانا ابوالکلام آزاد نے کلکتہ سے ہفتہ وار "الہلال" شروع کیا جس نے اشاعت کے چند ہفتوں کے اندر اندر ہی اپنا مقام پیدا کر لیا۔ نہ صرف سیاسی خیالات کے لحاظ سے ایک ریڈیکل اخبار تھا بلکہ اس نے مذہبی اور سماجی امور میں بھی لبرل روش اختیار کی۔ اسی زمانہ میں ۱۹۱۲ء میں بجنور سے "مدینہ" شائع ہونا شروع ہوا جس کے ایڈیٹر حمید الانصاری تھے۔ اس اخبار نے ملک کی سیاسیات میں اہم پارٹ ادا کیا اور مسلم رائے عامہ کو اس نے کافی متاثر کیا۔ لکھنؤ سے "ہمدم"، دہلی سے "ہمدرد" اور کانپور سے ہفتہ وار "آزاد" کی اشاعت شروع ہوئی۔

۱۹۱۳ء میں حاجی ساجد جان نے ہفتہ وار پٹنہ اخبار نکالا۔ "اتحاد" اور "اسٹار آف انڈیا" بھی پٹنہ سے شائع ہونا شروع ہوئے۔ مولانا آزاد نے ایک اور اخبار "البلاغ" شروع کیا۔ اس کے بعد پہلی جنگ عظیم کے شروع ہونے کے باعث ہندوستانی زبانوں کے اخبارات کو متعدد پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۹۱۹ء تک شاید ہی کوئی نیا اخبار نکلا ہو۔ ۱۹۱۹ء میں "حقیقت" لکھنؤ اور "پرتاپ" لاہور کی اشاعت شروع ہوئی۔ ۱۹۲۰ء میں لالہ لاجپت رائے نے "بندے ماترم" نکالا۔ اب یہ اخبار دہلی سے شائع ہو رہا ہے۔ مولانا ظفر علی خاں نے "زمیندار" کی اشاعت شروع کی جس کی پالیسی قوم پرستی پر مبنی تھی۔ ۱۳ اپریل ۱۹۲۳ء کو مہاشہ خوشحال چند نے "ملاپ" اخبار کی بنیاد رکھی۔ "ملاپ" اور "پرتاپ" درحقیقت آریہ سماج کے اخبارات تھے جن میں سے اول الذکر کالج سیکشن کے خیالات کی رو سے اور مؤخر الذکر گورو کل سیکشن کے خیالات کی ترجمانی کرتا تھا۔ اسی سال سوامی شردھانند نے دہلی میں "تیج" کی بنیاد رکھی اور شری دیش بندھو گپتا اس کے منیجنگ ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ "تیج" نے باقاعدگی سے قوم پرستی پر مبنی پالیسی پر عمل کیا اور اس نے سماجی برائیوں کو دور کرنے کیلئے بھی کام کیا ہے۔ ۲۷-۱۹۲۵ء کے قریب قریب دو اُردو روزناموں "سیاست" اور "انقلاب" کی اشاعت شروع ہوئی۔ ان کا نقطۂ نظر بالکل فرقہ پرستی پر مبنی تھا اور بالآخر انھوں نے مسلم لیگ سے رشتہ جوڑ لیا۔ آل انڈیا شیعہ کانفرنس نے ۱۹۲۵ء میں لکھنؤ سے "سرفراز" شائع کرنا شروع کیا اور جمعیۃ العلماء ہند نے "الجمعیۃ" نکالا جس کے ایڈیٹر مولانا محمد عثمان فارقلیط مقرر ہوئے۔ ہندوستان ٹائمز کے مطالبے پر گوسوامی گنیش دت نے ۱۹۲۶ء میں لاہور سے "ویر بھارت" اخبار نکالا۔ ۱۹۳۰ء میں اے۔ آر۔ شیخ، اے۔ ڈی اور ایس۔ ایچ عثمانی نے کلکتہ میں "روزانہ ہند" کی بنیاد رکھی اور ۱۹۳۲ء میں کلکتہ سے محمد عثمان آزاد نے ایک اور روزنامہ "انجام" شائع کرنا شروع کیا۔ ۳۲-۱۹۳۱ء کے عرصے میں کئی اور رسائل کی اشاعت شروع ہوئی۔ شری رینا تھ نے ۱۹۳۱ء میں سری نگر سے "رہبر" نکالا اور شری خلیل بدر نے ۱۹۳۶ء میں بھوپال سے "الحمراء" کی اشاعت شروع کی۔ اسی دوران میں سردار دیوان سنگھ مفتون نے "ریاست" نکالا جس میں زیادہ تر ریاستوں کے مسائل پر بحث کی جاتی تھی۔ ۱۹۳۶ء میں اُردو ماہنامہ "[illegible]" کی اشاعت شروع ہوئی۔ ۱۹۳۷ء میں خوشتر گرامی نے "بیسویں صدی" کی اشاعت شروع کی۔ ۱۹۳۸ء میں بمبئی پریسیڈنسی سے شائع ہونے والے اُردو روزناموں میں "خلافت"

(باقی صفحہ ۱۱ کالم ۴)

بقیہ
دبستانِ لکھنؤ

وصل اس کا خدا نصیب کرے
میر جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

جرأت کے ہاں اس طرح پوری ہوتی ہے ؎

شب کیا پہ چپکے چپکے وہ شوخ و شنگ بولا
دیکھو نہ بول لیں گے ہم گر پھر پلنگ بولا

لکھنوی شاعری کی خرابیاں دراصل اس ماحول کی خرابیاں تھیں جو انشا، جرأت اور رنگین کی ناپختہ کار طبیعتوں نے بہت جلد قبول کر لیں اور جس کے ذریعہ انھوں نے شعر و ادب کو مبتذل کر دیا۔ میر، سودا اور مصحفی کے دل و دماغ میں داخلیت اور شاعرانہ رمزیت رچی ہوئی تھی اس لئے انھیں لکھنؤ کی ادبی فضا سازگار نہ آسکی۔ ان میں صرف مصحفی ایسے ہیں جنھیں زندہ رہنے کے لئے اپنی طبیعت کے خلاف اس انداز میں بھی شعر گوئی کرنی پڑی۔

انشا، رنگین اور جرأت نے جس قسم کا مزاج پایا تھا وہ لکھنؤ کے ماحول میں خوب پروان چڑھا۔ دہلی کی "آہ" کے مقابلہ میں لکھنؤ میں "واہ" کا دبستان کھل گیا اس طرح دہلی کی شاعری، ان نوجوان شعرا کے ہاتھوں جس پست معیار پر آپڑی تھی اسی پر لکھنوی شاعری کی بنیاد رکھی گئی۔ شاعری میں معاملہ بندی، محشر نگاری اور جنسی واردات کے مضامین نے جگہ لے لی۔ شعر کا وہ خاص حسن جسے رمز یا اشاریت سے تعبیر کیا جاتا ہے باقی نہ رہا۔ معشوق کے اعضائے جسمانی کا ذکر بڑی بے حیائی اور لذت اندوزی کے ساتھ شعر میں ہونے لگا عاشق و معشوق کے تعلقات کی وضاحت اور جنسی فعل کا اعلان شعر میں بڑے فخر سے کیا جانے لگا اس دور کی شاعری کا معیار یہ تھا ؎

مدت میں ملاقات میسر جو ہوئی ہے
اب دل یہ(?) کہتا ہے کہ اس بات کی ٹھہرے

بوسے چپٹ کے لے لے رنگیں بقول غالب[1]
"عالم شراب کا ہے اور بے حجابیاں ہیں" (رنگین)

دیکھی جب مجھے اس شوخ طرح دار کی گیند
اس نے محرم کو سنبھال اور ہی تیار کی گیند

کب یہ جانوں ہوں کہ صرف انگشت کی ٹھہرے
تب خوش ہو مرا دل کہ جب اس بات کی ٹھہرے (انشا)

یاد آتا ہے یہ جب کہتا تو اڑ جاتی ہے نیند
[illegible]
یاد آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا
جنبش نہ کی اور دیں اس کو وہ گدرایا ہوا (جرأت)

تصنع اور تکلف لکھنؤ کی معاشرت کا ایک اہم جز تھا جس کی عکاسی لکھنؤ کی شاعری سے بخوبی ہوتی ہے۔ لکھنؤ کے شاعروں نے جذبات نگاری کو پس پشت ڈال کر تصنع، بلاغت اور لفظی مرصع کاری کو شاعری کی بنیادی ضرورت قرار دیا جس کی وجہ سے خارجی کیفیات اور مضامین کو فروغ حاصل ہوا۔ حسن و عشق کے معاملات کی جزئیات پر اس درجہ زور دیا گیا کہ ریختہ کی زبان ان مضامین کے لئے تشنہ نظر آنے لگی چنانچہ ریختہ سے ریختی کی طرف توجہ دی گئی اور اب بات کنگھی، چوٹی اور مسّی سے الجھ کر بند اور پلنگ تک پہنچ گئی۔

اگرچہ دہلی میں بھی اکثر شعرا امرا سے وابستہ تھے مگر شعر گوئی کے معاملہ میں وہ آزاد تھے انھیں کسی امیر یا دولت مند کو خوش کرنے کے لئے کم شعر کہنے ہوتے تھے لیکن لکھنؤ کی روش اس معاملہ میں بالکل بدلی ہوئی تھی۔ یہاں نواب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے دربار میں جد و جہد، سازش، خوشامد اور چاپلوسی کرنی پڑتی تھی اس میں اردو شاعروں نے نمایاں حصہ لیا نواب کی مرضی اور علم کے مطابق شعر کہنا بھی اسی قسم کی ایک کوشش تھی۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لکھنؤ والوں نے زبان کو زیادہ سلیقہ اور خوبصورتی سے استعمال کیا کوئی شخص دبستانِ لکھنؤ کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتا۔ یہ حقیقت ہے کہ لکھنؤ کے شاعروں کے طفیل اردو زبان میں گہرائی اور وسعت پیدا ہوئی اردو ادب کی پوری تاریخ میں لکھنؤ کا یہ دور اس سلسلہ میں قابل قدر ہے۔ جب تنگنائے غزل کو محسوس کیا گیا۔ شاعروں نے غزل کے میدان کو محدود دیکھ کر دوسری اصناف سخن میں طبع آزمائی شروع کی یعنی شعرا مثنوی، مرثیہ اور قصیدے وغیرہ کی طرف رجوع ہوئے اردو میں اس سے قبل بھی مثنوی، مرثیے اور قصیدے وغیرہ پہ طبع آزمائی کی گئی تھی۔ لیکن یہ اصناف سخن صرف اسی دور میں اپنے عروج کو پہنچی ہیں۔ سودا اور انشا نے قصیدے کو، انیس اور دبیر نے مرثیے کو، میر حسن، دیا شنکر نسیم اور نواب مرزا شوق لکھنوی نے مثنوی کو بام عروج پر پہنچایا۔

لکھنوی شاعری نے اگرچہ ایک طرف شعر کی داخلیت کو مجروح اور رمزیت کو عریاں کیا ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے انداز بیان میں جدت اور شستگی کا ثبوت دیا ہے۔ آج زبان میں جو مرصع کاری، نقش و نگار، ظاہری حسن اور قوس قزح کے سے رنگ نظر آتے ہیں یہ صرف اور صرف دبستانِ لکھنؤ کی دین ہیں

[illegible]

[1] غالب [illegible]

بقول پروفیسر آل احمد سرور:

"لکھنؤ اسکول میں بہت سی خرابیاں سہی مگر اس کا یہ احسان کیا کم ہے کہ اس نے شاعری کی قدر کی اور شعرا کو سر آنکھوں پر بٹھایا، شاعری کو فن بنایا اور فن کے آداب وضع کئے۔ ایسا کرنے میں انھوں نے بہت سی لطافتوں کا خون کر دیا بہت سے نرم اور شیریں الفاظ کو ٹکسال باہر قرار دیا۔ قواعد کا نہایت سخت معیار بنایا۔ مگر ان کی اس خدمت کا اعتراف ضروری ہے کہ انھوں نے ہر صنف میں اردو شاعری کی سرپرستی کی۔ اسے وسعت عطا کی، تنوع دیا، رنگا رنگی بخشی۔ جہاں خونِ جگر کے داغ تھے وہاں نئے نئے پھول کھلائے، جہاں محرومی اور ناکامی تھی وہاں نشاط اور کامرانی کی لے پیدا کی۔ ماورائیت کے بجائے ارضیت سکھائی۔ جسمانی حسن کا احساس دیا، شاعری کو گرد و پیش کی حقیقتوں کا آئینہ بنایا اور اس آئینہ سے ہر قسم کا کام لیا۔"[1]

ناسخ کے دور سے زبان اور لکھنؤ اسکول کی خصوصیات واضح طور پر ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ یہ دور زبان و بیان اور موضوع و مواد کے اعتبار سے زیادہ صحت مند قدروں کا حامل ہے۔ انشا، رنگین اور جرأت کی سی مبتذل خارجیت اس دور کی غزلیہ شاعری میں کم ملتی ہے۔ ناسخ نے از سر نو زبان کی اصلاح کی۔ نئے نئے الفاظ، محاورات اور تراکیب تراشی گئیں، پرانے الفاظ کو ترک کیا گیا۔ ایسا کرنے میں اگرچہ زبان کو چار چاند لگ گئے اور زبان بہت سے نئے محاورات اور الفاظ سے مالا مال ہو گئی لیکن بعض جگہ ناسخ نے ٹھوکریں بھی کھائیں اور اردو کو بہت سے ایسے الفاظ سے محروم کر دیا جو اگرچہ ہندی آمیز تھے لیکن نہایت سبک، شیریں، سلیس اور سہل تھے۔ ایسے الفاظ شعر میں دھیما لب و لہجہ پیدا کرنے کے لئے بہت موزوں ہوتے ہیں لیکن بنیادی طور پر لکھنوی مزاج کو انکی ضرورت بھی نہیں۔ ناسخ کی طرز اس قدر مقبول ہوئی کہ شاہ نصیر، ذوق، ظفر اور داغ سب اس سے متاثر ہوئے۔ مومن اور غالب نے بھی ناسخ کا تتبع شروع کیا تھا لیکن شکر ہے ان سے یہ انداز سخن نبھ نہ سکا ورنہ آج ان دونوں کا نام بھی صرف زبان اور محاورے کے کرتب دکھانے والوں میں ہی شمار ہوتا۔ ذوق اور داغ اس دبستان سے شعوری یا لاشعوری طور پر زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ اگر داغ لکھنؤ میں پیدا ہوئے ہوتے اور زندگی بھر وہیں رہتے تو انکی شاعری میں تھوڑے بہت الفاظ کا ضرور فرق ہو جاتا لیکن انداز سخن یہی رہتا۔

[1] ملاحظہ ہو پیش لفظ "مقدمہ کلام آتش" صفحہ ۳ و ۴

بقیہ

بھارت میں اردو صحافت کی تاریخ و ترقی

"ہلال"، "الہلال" اور "اجمل"۔ اور رسالوں میں "خاتون"، "مصور"، "سروش"، "تنویر" اور "صبح امید" قابل ذکر تھے۔

"دین دنیا"، "صدق"، "مالی" اور "پارس" وغیرہ اس زمانہ کے کچھ اور اخبارات تھے۔ ۱۹۳۹ء میں دہلی سے ماہنامہ "شمع" کی اور بمبئی سے اسی سال "انقلاب جدید" اور "ہندوستان ڈیلی" کی اشاعت شروع ہوئی۔ مدراس سے سید عظمیٰ کالا صاحب نے "مسلمان" اخبار نکالا۔ اس زمانے میں بہار سے شائع ہونے والے اخبارات میں "الحق"، "بیباک"، "پنچ"، "تاج"، "ندیم" اور "نجیب" وغیرہ قابل ذکر تھے۔ ۱۹۳۰ء میں لاہور سے "اجیت" اخبار شائع ہونا شروع ہوا۔ اکالی دل کی نیک خواہشات اس کے ساتھ شامل تھیں۔ ۱۹۴۳ء میں لاہور سے "پربھات" اخبار نکلنا شروع ہوا جس کے ایڈیٹر شری نانک چند ناز تھے۔ پنجاب میں یہ پہلا اخبار تھا جسے ورکنگ جرنلسٹوں نے کوآپریٹو بنیادوں پر شروع کیا۔ اسی سال سید نظیر حیدر نے پٹنہ سے "صدائے عام" نکالا اور سہیل عظیم آبادی نے روزنامہ "ساتھی" کی اشاعت شروع کی۔ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے انگریزی اخبار "پیپلز وار" کا اردو ایڈیشن "نیا زمانہ" بمبئی سے چھپنا شروع ہوا۔ ۱۹۴۵ء میں شری جواہر لال نہرو نے لکھنؤ میں "قومی آواز" کی بنیاد رکھی جس کے ایڈیٹر حیات اللہ انصاری مقرر ہوئے اور اسی سال لکھنؤ سے چودھری خلیق الزماں نے "تنویر" اخبار نکالا۔

ریاست جموں و کشمیر نے اخبار نویسی کے میدان میں بہت دیر سے قدم رکھا لیکن یہاں کے اخبارات اب تیزی سے ترقی کر رہے ہیں اور یہ امر باعث تسکین ہے کہ اخبارات کو ترتیب دینے کے طریقے اور خبروں کی اشاعت کے بارے میں جدید سائنٹفک طریقوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

"پرتاپ" اور "ملاپ" اب دہلی سے شائع ہو رہے ہیں۔ یہ دونوں اخبارات بیک وقت جالندھر سے بھی شائع ہوتے ہیں اور "ملاپ" کا ایک ایڈیشن حیدر آباد سے بھی شائع ہوتا ہے۔ تقسیم کے بعد "ویر بھارت" امرتسر سے شائع ہونا شروع ہوا۔ لالہ جگت نرائن نے جالندھر سے "ہند سماچار" نکالا۔ ۱۹۵۲ء میں کمیونسٹ پارٹی نے جالندھر سے "نیا زمانہ" شائع کرنا شروع کیا۔

آج کل اردو اخبارات کانگریس، سوشلسٹوں، کمیونسٹوں، اکالیوں اور بعض دوسری سیاسی پارٹیوں کے خیالات کی ترجمانی کر رہے ہیں۔

اردو اخبارات و جرائد کے ٹائپ اور چھپائی کے جدید طریقوں سے کام لینے میں پس و پیش کے باعث اردو اخبار نویسی کی نشو و نما میں کئی لحاظ سے رکاوٹ پیدا ہوئی ہے۔ اگرچہ اردو اخبار نویسی کے مختلف مراکز سے شائع ہونے والے بعض اہم اخبارات نے آفسیٹ چھپائی کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ تاہم ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں ابھی تک زیادہ تر لیتھو گرافک پرنٹنگ سے ہی کام لیا جا رہا ہے اور ٹائپ کو اختیار کرنے کے حق میں آواز اٹھائی گئی ہے اور جتنا جلدی اسے وسیع پیمانے پر اختیار کیا جائے اتنا ہی اردو اخبار نویسی کے مستقبل کے لئے بہتر ہو گا۔

تبصرے

خلیل الرحمن اعظمی

فکر غالب

مصنف: پرتھوی چندر
ناشر: پرتھوی چندر
مطبوعہ: پیام وطن پریس دہلی
قیمت: تین روپے آٹھ آنے

موجودہ دور میں اُردو تنقید اور تحقیق نے اپنی بیشتر توجہ "غالب" کی طرف منعطف کر دی ہے اور "غالبیات" کا یہ سلسلہ اب اس قدر وسیع ہوتا جا رہا ہے کہ دہلی کے ممتاز تاجر سیٹھ پرتھوی چندر نے بھی اس کار خیر میں شرکت ضروری سمجھی۔ موصوف کا تعارف کراتے ہوئے جناب تلوک چند محروم لکھتے ہیں کہ:

"آپ نے کلام غالب کا بہ نظر غائر مطالعہ ہی نہیں کیا ہے بلکہ مرزا کے نام اور کلام سے عشق ہے۔ یہ کتاب غالبیات میں ایک مفید اور دلچسپ اضافہ ہے۔"

جہاں تک "مفید" ہونے کا تعلق ہے اس کا مطلب غالباً یہ ہے کہ "یادگار غالب" اور بعض دوسری کتابوں میں غالب کے سوانح پر جو کچھ مواد ملتا ہے اسے سیٹھ صاحب نے اپنے مخصوص اور سادہ انداز میں خلاصہ کر دیا ہے اور مبتدیوں کو ان کتابوں کے مطالعے کی زحمت سے بچا لیا ہے اور جہاں تک "دلچسپ" ہونے کا تعلق ہے وہ خود سیٹھ صاحب کے اپنے تنقیدی خیالات ہیں جن میں بعض "نادر" انکشافات ملتے ہیں مثلاً

"ہندوستان میں بعض ادیب اور مضمون نگار ایسے بھی ہیں جو شعراء کے کلام کی مبالغہ آمیز تعریف کر کے اسے مذہبی مقدس کتابوں سے بھی بڑھا دیتے ہیں۔ بہار کے ایک ادیب شمس بجنوری نے غالب کی تعریف میں مبالغہ کر کے لکھا ہے کہ ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، وید مقدس اور دیوان غالب۔

نا سمجھی کی حد ہو گئی۔ اس نادان اور کم فہم مضمون نگار نے سستی شہرت حاصل کرنے کے لئے غالب کے کلام کو وید مقدس اور گیتا کے مقابلے میں پیش کیا ہے۔ کیا اور کوئی مذہبی کتاب نہ رہی۔ انجمن ترقی اُردو علی گڑھ کے کارکنان کا فرض ہے کہ وہ ایسے مضمون نگاروں سے بیزاری کا اظہار کریں۔ ان کا شکوہ بند کریں کہ اس طرح ادب کی خدمت نہیں ہوتی بلکہ باہمی نفرت پیدا ہونے کا خطرہ ہے۔"

ایک اور تنقیدی رائے ملاحظہ فرمایئے:

"سید احتشام الدین صاحب نقد غالب میں صفحہ ۲۲۴ پر لکھتے ہیں کہ غالب کی ذہنی ترقی کا دور غدر تک ختم ہو چکا تھا گو وہ اس کے بعد بارہ سال تک زندہ رہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ غدر کے بعد ان کی شاعری تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ حالانکہ غدر کے بعد کے دس سال ہی تو مرزا کی زندگی کا حاصل ہیں۔ اس دس سال کے عرصے میں انھیں قدرے سکون حاصل ہوا۔ اس عرصے میں انھوں نے شاعری میں وہ ترقی کی کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں سے ان کے شاگرد اپنا اپنا کلام اصلاح کے لئے بھیجتے تھے اور حضرت غالب ان کے کلام میں مناسب اصلاح کر کے اسے واپس کر دیتے تھے۔ اگر ان کی شاعری ختم ہو جاتی تو وہ اپنے شاگردوں کو اصلاح کیسے دیتے؟"

اس میں کیا شک ہے کہ سیٹھ صاحب موصوف کے یہ تحقیقی انکشافات اور تنقیدی خیالات نہ صرف "دلچسپ" بلکہ ماہرین غالبیات کے لئے "عبرت آموز" اور "بصیرت افروز" ہیں۔

اسلامی کتب خانوں کی سیر

مصنف: حاجی محمد زبیر
ناشر: محمد عزیز۔ فرحت منزل۔ بدر باغ، علی گڑھ
قیمت: ایک روپیہ

حاجی محمد زبیر صاحب جو مسلم یونیورسٹی لائبریری میں لائبریری اسسٹنٹ ہیں، نہ صرف یہ کہ لائبریری کے انتظامی معاملات میں گہرا تجربہ رکھتے ہیں بلکہ کتب خانوں کی تاریخ اور کتب خانے کی تنظیم کے سائنسی اصولوں پر بھی ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ موصوف نے اس فن سے متعلق اردو زبان میں متعدد کتابیں لکھی ہیں اور اس سلسلے میں ایک اہم اور مفید خدمت انجام دی ہے۔ فن لائبریری کے علاوہ ان کے علمی اور تحقیقی مقالات بھی قابل توجہ ہیں۔ اس سے پہلے ٹیپو سلطان کے کتب خانے پر ان کی ایک کتاب شائع ہو کر خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔ اسلامی کتب خانوں سے متعلق یہ کتاب ان کے ذوق تحقیق کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اس موضوع پر بہت پہلے علامہ شبلی نے ایک مضمون لکھا تھا جو ان کے مجموعۂ مقالات میں شامل ہے لیکن وہ مضمون بہت مختصر تھا۔ حاجی صاحب نے اس کام کو آگے بڑھایا ہے اور اس سلسلے میں خاصا مواد فراہم کر دیا ہے۔ اس کتاب میں بغداد، قاہرہ، شیراز، طرابلس، بخارا، حلب، مراغہ، اور اندلس کے کتب خانوں سے متعلق تاریخی معلومات یکجا کر دی گئی ہیں۔ ان کتب خانوں کے قیام کی تاریخ، ان کا نظام، کتابوں کی نوعیت، غرض ہر پہلو پر نہایت تحقیق سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ حاجی صاحب کا اسلوب تحریر شگفتہ اور رواں ہے۔ یہ کتاب نہ صرف خواص کے لئے بلکہ ایک عام اُردو داں کے لئے بھی دلچسپ ثابت ہوگی۔

پبلشر و پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شایع کیا